"اچھا کامریڈ، پھر تم ڈھونڈو۔ ڈھونڈتے رہو۔"

"نہیں یار، میں اپنے بارے میں نہیں کہہ رہا۔ وہ تو قصہ ہی بہت پرانا ہو گیا۔"

کامریڈ زور سے ہنسا "کامریڈ۔ یہ قصہ کبھی پرانا نہیں ہوا کرتا۔" پھر افسردہ ہو گیا، "یہی تو خراب بات ہے کتنا ہی پرانا ہو جائے مگر ذرا کسی بہانے یاد آ جائے کمبخت تازہ ہو جاتا ہے"

کامریڈ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ بات کہہ کر جتنا وہ افسردہ ہوا اتنا ہی میں افسردہ ہوا کتنی دیر تک ہم دونوں چپ بیٹھے رہے چپ بیٹھے چائے پیتے رہے۔

"پھر یوں ہی میں بول اٹھا" ویسے کامریڈ، اس وقت میں نے واقعی اسے بہت ڈھونڈا تھا"

"پھر ملی؟"

"ملنا کہاں تھا۔ وہ تو بالکل ایسے اوجھل ہوئی۔ جیسے پرانی کہانیوں میں پری ایک جھلک دکھا کے غائب ہو جاتی تھی غریب شہزادہ بنوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ نتیجہ ڈھاک کے تین پات۔ مگر میرے معاملہ میں کچھ اور ہی گل کھلا"

"کیا؟"

"میں ڈھونڈ رہا تھا اسے۔ اور مل گئی وہ"

"وہ؟ وہ کون تھی؟"

"وہ بھی تھی۔"

"کامریڈ، پہیلیاں مت بوجھواؤ۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ یہ کونسا قصہ ہے؟"

"یہ دوسرا قصہ ہے ——— نہیں۔ پہلا قصہ۔ اس میں وہیں رہتے ہوئے کھنڈت پڑ گئی تھی۔ جب میں ادھر آ گیا تو آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ اور اب تو میرا دھیان ہی کہیں اور تھا۔ عین اس بیچ وہ اچانک سے آ گئی۔ ——— یار کامریڈ

کمال ہوگیا۔ ایک دم سے سارا کچھ جو میں بھول بیٹھا تھا دھیان میں آگیا جیسے میں اسی ساعت میں واپس چلا گیا ہوں۔ مگر کیا ہوا کہ وہ ایک دم سے چلی گئی۔ جیسے ایک دم سے آئی تھی۔"

"کامریڈ یہی ہوتا ہے اچانک سے آتی ہے۔ اچانک سے چلی جاتی ہے۔"

ایک دفعہ پھر چپ، وہ بھی، میں بھی۔ اپنے خیالوں میں گم۔ میں اپنے خیالوں میں گم۔

"یار کامریڈ!" آخر میں نے ہی خاموشی کی مہر توڑی "تم لوگوں کے پاس تو متبادل انتظام ہوتا ہے۔ عشق کا نعم البدل انقلابی جدوجہد۔ وہ نہیں تو یہ۔ مگر ہم جیسے اِدھر سے پٹیں تو کدھر جائیں۔

"انقلابی جدوجہد" کامریڈ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور چپ ہوگیا پھر بولا "ویسے میں اب سوچتا ہوں کہ اس وقت میں اس کے پیچھے گیا ہوتا تو وہ واپس آ ہی جاتی مگر اس وقت مجھ پہ سودا سوار تھا کہ انقلاب بس اب آیا توجہ اس طرف سے نہیں ہٹنی چاہیے" لمبا ٹھنڈا سانس لیا "سالا انقلاب بھی نہیں آیا اور وہ بھی چلی گئی۔"

"کامریڈ، وہ تو خیر چلی گئی۔ مگر انقلاب تو بقول تمہارے آوے ہی آوے۔ آج نہیں تو کل۔"

کامریڈ کو غصہ آگیا "یار یہ سالا کوئی انقلاب وقلاب نہیں آوے گا۔"

"کیوں نہیں آئے گا"؟

"بس کامریڈ، یار یہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ سب سالے فراڈیئے ہیں۔ ڈیوس کتے کے بچے" اور کچکچا کر ایک ہی سانس میں کتنی گالیاں دے ڈالیں۔ پھر اپنے تھیلے کو میرے سامنے کر دیا "دیکھتے نہیں ہو۔ آج میرا تھیلا خالی ہے۔"

میں نے حیرت سے اس تھیلے کو دیکھا جس میں پمفلٹ اور اخبار ٹھسا ٹھس بھرے

رہتے تھے" آج یہ خالی کیسے ہوگیا۔

"میں نے سارا کچرا نہر میں الٹ دیا"

"کامریڈ، کیا کہہ رہے ہو"

"صحیح کہہ رہا ہوں۔" یہ کہتے کہتے اس نے اپنا ایک گھٹنا کھول دیا" یہ گھٹنے دیکھ رہے ہو ان میں درد بیٹھ گیا ہے۔ خالی چائے کا ایک کپ چڑھایا اور تھیلا بغل میں داب نکل پڑا۔ پورے شہر کا گشت کرتا تھا۔ پمفلٹ، اخبار، کتابیں، ایک ایک دفتر میں ایک ایک شخص کو پہنچاتا تھا کہ کسی پہ تو اثر ہوگا۔ مگر کامریڈ، یاں یہ تو کسی پہ کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ میں نے سوچا کہ یہ سب چھپے ہوئے لفظ بے برکت ہیں جب ان کا کسی پہ اثر ہی نہیں ہوتا تو یہ لفظ محض کیلا کانٹی ہیں۔ دلوں میں اترتے نہیں۔ بس کاغذ کالے ہوتے ہیں تو میں نے سوچا کہ ان بے برکت لفظوں کے لیے میں کیوں اپنی جان ہلکان کر رہا ہوں۔ دفع کرو اس کچرے کو۔ تو میں نے نہر پہ جاکر اپنا تھیلا الٹ دیا۔ سب لفظوں کو نہر میں غرق کر دیا، کھڑا ہوگیا" بس یار چلو یاں سے"

"یار کامریڈ اب یہاں آئے ہیں تو ذرا تھوڑا وقت بیٹھیں"

"نہیں کامریڈ۔ یاں اب نہیں بیٹھا جاسکتا۔ سالوں نے وہ پنچ بھی غائب کر دی جس پہ دادا بیٹھا کرتے تھے"

یہ جا وہ جا۔

میں اکیلا دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ اوبڑ کھابڑ خیالوں نے رات تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ رات کو میں نے خواب دیکھا کہ جیسے وہ ہرا بھرا گھنا پیڑ ہے، وہی میں ہوں، وہی ——— بیچ ہی میں آنکھ کھل گئی۔ پھر میں صبح تک نہ سو سکا خواب میری آنکھوں میں صبح کے بعد تک پھوٹتا رہا۔

۱۶

"ارے ہاں اس کا ٹیلی فون آیا تھا۔"

"کس کا؟" میں چونک پڑا۔ فوراً دھیان اسی کی طرف گیا۔ اسی کا ہوگا۔ کتنی اُمید بھری نظروں سے میں نے زبیدہ کو دیکھا۔

"پراپرٹی ڈیلر کا۔"

"پراپرٹی ڈیلر کا؟ .... اچھا؟" توقعات کا سیلاب آن کی آن میں اُمنڈا اور آن کی آن میں بیٹھ گیا۔ آنکھوں کی چمک غائب۔ آواز میں مردنی۔ "کیا کہتا تھا؟"

"پوچھ رہا تھا کہ کیا سوچا ہے۔"

"کیا سوچا ہے؟ کس بارے میں؟"

زبیدہ نے مجھے غور سے دیکھا۔ شاید اُسے میرا یہ بے تعلقی کا لہجہ پسند نہیں آیا تھا۔ مگر یہ دانستہ تو نہیں تھا۔ میں ان دنوں اور ہی خیالوں میں تھا۔ فوری طور پر دھیان میں بات آئی ہی نہیں۔ زبیدہ نے ناخوشگوار سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر اُس نے بھی وہی بے تعلقی کا لہجہ اپنایا۔ خشک لہجہ میں مختصر جواب دیا۔ "آشیانے کے بارے میں۔"

آشیانے کے بارے میں؟ میں پہلے سٹپٹایا۔ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ میں اصل میں بیخبری میں پکڑا گیا تھا۔ میرے تو دھیان ہی سے وہ سارا قصہ رفع دفع ہو چکا تھا۔ جس روز پراپرٹی ڈیلر آشیانے کا گاہک لے کر آیا تھا اسی روز تو بوجان کی طبیعت بگڑی

تھی - ایسے لینے کے دینے پڑے کہ ان کی بیماری کے سوا کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔ پھر شیریں آن پہنچی - ہم دونوں بوجان کے سرہانے بیٹھے چراغ حویلی کی طرف جا نکلے۔ آشیانہ اپنے مسائل و معاملات کے ساتھ دھیان سے اوجھل ہو گیا اور اب ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا تھا - بوجان گذر چکی تھیں اور شیریں جا چکی تھی - چراغ حویلی میرے حافظے سے بسرنے لگی تھی۔ میں کتنا پریشان تھا۔

بوجان نے گذرتے گذرتے ہمارے حافظہ کو لو دیدی تھی۔ چراغ حویلی ایک دم سے اُن کے آخری دموں کے ساتھ ہمارے تصوّر میں کتنی منوّر ہو گئی تھی اور جب انہوں نے آخری ہچکی لی تو یہ امانت ہمیں پوری طرح منتقل ہو چکی تھی۔ ہم نے ان کی یاد کے سائے میں بیٹھ کر کس خوبصورتی سے ان درو دیوار کو اپنے بیچ زندہ کیا اور اس بیچ سے اپنے آپ کو برآمد کیا۔ ہم ایسے خوش ہوئے کہ جیسے برسوں کی کھوئی ہوئی ہماری چیز ہمیں مل گئی ہے۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ شیریں چلی گئی - تو شیریں جا چکی تھی اور میں اکیلا اس امانت کو سنبھال کر نہیں رکھ سکتا تھا۔

اب میری سمجھ میں آرہا تھا کہ کیوں میرے اجداد ایک عمر پر پہنچ کر تذکرہ لکھنے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ یا تو بوجان کی سی فضائے یاد ہو "جہاں دیکھے ان دیکھے سب زمانے سدا بہار تھے کہ بوجان تو اپنی ذات میں زمانوں کا سنگم تھیں کہ کتنے زمانے کہاں کہاں سے آکر یہاں ملتے تھے اور خوش اسلوبی سے جُدا ہو جاتے تھے یا پھر آدمی تذکرہ لکھے۔ نہیں تو یادیں بسر جائیں گی یا بکھر جائیں گی اور آپس میں رل مل جائیں گی۔ تو مجھے بھی، میں نے سوچا، تذکرہ لکھنا چاہیئے۔ مگر یہ خیال اتنا مضحکہ خیز نظر آیا کہ میں نے اسے فوراً ہی رد کر دیا۔ تذکرہ لکھنے کے لئے آدمی کو روایت میں رچا ہوا ہونا چاہیئے نہیں تو اوّل پٹال ہی لکھے گا۔

"کل وہ پھر فون کرے گا؟" زبیدہ تھوڑا چپ رہنے کے بعد پھر بول پڑی۔

"اچھا؟"

"ہاں میں نے تو اس سے کوئی بات کی نہیں۔ کہہ دیا ہے کہ کل اخلاق صاحب گھر پہ ہوں گے۔ وہ ہی بتائیں گے۔"

یہ بات بظاہر میں نے بے اعتنائی سے سنی۔ لیکن دل میں ایک تشویش پیدا ہو گئی کہ یہ تو پھر وہی مصیبت شروع ہو گئی۔ پھر وہی وقت بے وقت کے پھیرے۔ کبھی دروازے کی گھنٹی بج رہی ہے کبھی فون بول رہا ہے۔ مجھے وہ دن یاد آ گئے۔ ہر وقت یہ لگتا تھا کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے۔

"پہلے سے سوچ لو کہ کیا بات کرنی ہے۔"

"ہاں سوچ لیں گے۔" اور اس سے پہلے کہ زبیدہ دوسری بات کرے میں نے توس کے ریزے طشتری میں اٹھائے اور باہر برآمدے میں نکل گیا۔

توس کے ریزے ہار سنگھار کے سائے میں بکھیرے اور برآمدے میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ پنچھی سبھا ترت پھرت اکٹھی ہو گئی۔ گوریاں تو جیسے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ فوراً ہی آن پہنچیں۔ بلبلوں کا جوڑا تھوڑا بعد میں آیا۔

انہیں کے پیچھے دو گرسلین بھی آ گئیں۔ ایک کوّا بھی بیچ میں آن دھمکا۔ گلہری اوپر کی شاخ سے چلی اور کودتی پھاندتی آن موجود ہوئی۔ ایک گہری نیلی پدی بھی ہار سنگھار کی شاخ پہ بیٹھی چوں چوں کرتی نظر آ رہی تھی۔ مجھے اس آن ایک عجب سا خیال آیا کہ شاما چڑیا بھی یہاں آ گئی ہوتی تو یہ سبھا مکمل تھی۔ شاما چڑیا بس میرے دھیان کو پر لگ گئے۔

"اخلاق، اور اخلاق۔ شاما چڑیا۔"

"کہاں ہے۔"

"وہ بیٹھی ہے۔"

"ہولے بول۔ سن لے گی تو اڑ جائے گی۔"

"ہولے ہی تو بول رہی ہوں۔ اس باولی کو تو پتہ ہی نہیں ہے کہ ہم یاں پہ ہیں۔"

آہستہ سے ایک قدم۔ پھر دوسرا قدم۔ شیریں مجھے ہدایات دے رہی ہے۔ میں شیریں کو ہولے بولنے کی تاکید کر رہا ہوں۔ ہم بالکل منڈیر کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ بس اسی آن شاما چڑیا اپنی دُم ہلاتی ہے اور پھر سے اُڑ جاتی ہے۔

"شیریں کی بچی، تو نے اُسے اُڑایا ہے۔"

"ارے واہ میں کیوں اُڑاتی۔ میں نے تو تجھے بتایا تھا۔ تجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ وہ بیٹھی ہے۔"

"تو کانا پھوسی کئے چلی جا رہی تھی۔ بس اس کے کان میں بھنک پڑ گئی۔"

"باولے خاں، شاما چڑیا کے کان کہاں ہوتے ہیں۔ جب اس کے کان نہیں ہیں تو سنے گی کیسے۔"

اور اسی کے ساتھ ایک اور تصویر دھیان میں اُبھر آئی۔ گرمیوں میں منہ اندھیرے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ سامنے منڈیر پہ شاما چڑیا عجلت میں اُتری ہے۔ دھیمی میٹھی آواز میں چہکتی ہے، دم کو تیز تیز گردش دیتی ہے اور اُڑ جاتی ہے جیسے بس یہ بتانے آئی ہو کہ صبح ہو گئی ہے۔

میں نے سوچا کہ میں اصل میں شاما چڑیا سے شروع ہوتا ہوں۔ سو اگر میں واقعی تذکرہ لکھنے لگوں تو میں شاما چڑیا سے اس کی ابتدا کروں گا۔ پھر وہی خیال کہ اگر میں تذکرہ لکھوں۔ میں نے اس خیال کو کتنا رد کیا۔ مگر وہ تو میرے اندر سماتا ہی چلا گیا۔

ابتدا کرتا ہوں اس پیدا کرنے والے کے نام سے جس نے شاما چڑیا کو پیدا کیا۔

مگر شاما چڑیا پیدا کیسے ہوئی۔ ہمارے پنڈت گنگادت مہجور کہا کرتے تھے کہ پرجاپتی اور اوشا نے مل کر سب انسان حیوان کو جنم دیا۔ اوشا نے پرجاپتی کی لالسا سے بچنے کیلئے سو روپ بدلے۔ مگر وہ جس مخلوق کا روپ بھرتی پرجاپتی بھی اسی مخلوق کے نر کا روپ لے لیتے اور اس روپ میں اس سے صحبت کرتے۔ اس کے نتیجے میں وہ مخلوق جنم لیتی۔ پنڈت گنگادت کا یہ بیان اگر صحیح ہے تو پھر مجھے لگتا ہے کہ اوشا نے سب سے پہلے شاما چڑیا کو پیدا کیا اور شاما چڑیا کے ساتھ رنگ رنگ کی مخلوق پیدا کی۔ مگر رنگوں کا فرق کیوں؟ اجل پنکھ دیئے بگلا کو، کوئل کس بدھ کاری ـــ خیر یہ اس کی اپنی مصلحتیں ہیں۔ بہر حال تعریف اس پاک ذات کی جس نے شاما چڑیا کو پیدا کیا اور دنیا بنائی اس رنگ سے کہ اوپر آسمان پاٹ دیا جس کی چال ٹیڑھی ہے اور نیچے زمین بچھائی۔ زمین پر دریا بہائے، گنگا ندی، جمنا ندی، نہر فرات، پھر سمندر، سبزہ زار، ریگ زار، کوہسار مگران کے بیچ مقتل کیسے نمودار ہو گئے۔ کورو کشیتر، کربلا، سری رنگاپٹم۔

خیر آدمی کو ٹھکانے لگانا کوئی مسئلہ نہیں مسئلہ یہ چلا آتا ہے کہ لاش کو کیسے ٹھکانے لگایا جائے۔ قابیل نے اسی تردد میں پوری زمین کو کھوند ڈالا۔ لاش کے بوجھ سے اس کے کاندھے دکھنے لگے تھے۔ مسئلہ تب سے جوں کا توں چلا آرہا ہے۔ کاندھے تب سے دکھ رہے۔ دکھنے ہی ہیں کہ مولد کہیں مقتل کہیں۔ مدفن کہیں۔ آدمی آنکھ کہاں کھولتا ہے سوتا کہاں جاکر ہے۔ میرے مورث اعلیٰ خلد آشیاں احمد باللہ اصفہاں کی مٹی تھے قزوین کی خاک میں جاکر آسودہ ہوئے۔ ان کے فرزند حکیم علی شیر ریحان قزوین میں پلے بڑھے۔ مگران کا خالی قصر ریحان قزوین میں رہ گیا۔ خود جہاں آباد کی خاک تلے جاکر آرام کیا۔ قضا کہاں سے کہاں لے گئی۔ مکینوں کو۔ میرے اجداد میں کس نے کہاں آنکھ کھولی۔ کہاں جاکر آنکھ بند کی۔ ہاں میرے دادا یعنی میاں جان نے سخت صبر و استقلال کا مظاہرہ کرکے اپنی تقدیر کو اجداد کی تقدیر سے الگ کر لیا۔ اپنی جگہ پتھر کی طرح جمے

رہے۔ جہاں آنکھ کھولی تھی وہیں آنکھ بند کی۔ یوں وہ مٹی کے افسوس سے بچ گئے۔ مگر اس کے بدلے میں دوسرے افسوس ان کے نوشتے میں لکھے گئے۔ دکھ اور افسوس سے تو بہرحال آدمی کو مفر نہیں ہے اور اپنے خاندان کی ریت میں نے یہ دیکھی کہ ہر پینٹری کے ساتھ کوئی بڑا افسوس وابستہ ہوگیا۔ میرے مورث اعلیٰ احمد باللہ جب تک قزوین میں رہے بیت الابیض کو یاد کرتے رہے اور اصفہان کی مٹی کے لئے افسوس کرتے رہے۔ حکیم علی شیر ریحان کے مرمے نے جہان آباد کے کتنے نینوں کو سکھ دیا کتنی اندھی آنکھوں کو روشن کیا مگر وہ مستقل کفِ افسوس ملتے تھے اور کہتے تھے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے قزوین کی کتنی آنکھوں میں اندھیرا اترا اور ہم انہیں روشن نہ کر سکے۔ میرے لکڑدادا حکیم گل زباغ علی نے چراغ حویلی کی صورت میں ایک نیا محل کھڑا کر دیا۔ مگر گلستان محل کے لئے رونا نہ گیا۔

میں کن اگلے پچھلے قصوں میں پڑ گیا۔ اگلوں کے افسوس اگلوں کے ساتھ گئے۔ اب میں ہوں اور میرے اپنے افسوس ہیں۔ ہر زمانے کے اپنے افسوس ہوتے ہیں اور اپنی مسرتیں راحتیں۔ اگلے زمانے کے ستم ایجادوں نے کھوپڑیوں کے مینار کھڑے کئے۔ یار و اغیار کی آنکھیں نکلوائیں اور اس میں راحت پائی۔ اس زمانے نے اپنی ضرورتوں کے حساب سے ستم ایجاد کئے ہیں۔ وہ میرے اجداد کا زمانہ تھا۔ یہ میرا زمانہ ہے۔ مجھے چاہیئے کہ اپنی ذات سے اور اپنے زمانے سے غرض رکھوں۔ وہی طور اپناؤں جو میاں جان نے اپنایا کہ حمد و نعت کے بعد اپنا اور اپنے زمانے کے آشوب کا تذکرہ شروع کر دیا۔ تذکرے کا یہی اسلوب ہے۔ اسی میں سہولت بھی ہے۔ میں اور میرے زمانے کا آشوب مگر میں کہاں سے شروع ہوتا ہوں اور میرا زمانہ کب سے شروع ہوتا ہے۔ خیر میں تو شاما چڑیا سے شروع ہوتا ہوں۔ مگر میرا زمانہ۔ وہ کہاں سے کب سے شروع ہوتا ہے۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے جو بھی زمانہ ملا خراب ملا یا زمانہ سدا سے خراب چلا آرہا

ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں چراغ حویلی میں تھا اور جب روز صبح سویرے منہ اندھیرے اوشا دھندکے میں لپٹی منڈیر پہ آکر درشن دیتی، میٹھا گیت گاتی اور اوجھل ہو جاتی۔ مجھے شیریں سے شکایت ہے عین وقت پہ کوئی گڑبڑ کر دیتی تھی یا گڑبڑا جاتی تھی۔ سو میں کبھی شاما چڑیا کو اس کے گرم دھڑکتے پپوٹے کے ساتھ اپنی مٹھیوں میں محسوس نہیں کر سکا۔ شاما چڑیا ہمیشہ میرے لئے دور کا درشن رہی۔ تو محرومی کوئی آج کی نہیں ہے۔ پھر بھی وہ زمانہ اچھا تھا۔ شاما، اوشا، شیریں۔ ایسا لگتا تھا کہ سارا زمانہ گھل مل کر چل رہا ہے۔ کہیں کوئی تفریق ہی نظر نہ آتی تھی۔ میں اور شیریں دن دن بھر ہرے بھرے گھنے پیڑوں کی دھوپ چھاؤں میں پھرتے پھراتے رہتے۔ گرمیوں میں امبیوں سے لدے پیڑ ہمیں رجھاتے۔ جاڑوں میں ان پیڑوں سے بے تعلق ہو کر املی کے پیڑوں کے ساتھ الجھتے سلجھتے رہتے۔ ہر رُت کھٹاس سے شروع ہوتی اور میٹھی ہوتی چلی جاتی۔ امیاں کتنی کھٹی ہوتیں۔ ساون کی بوندوں کے ساتھ ان میں رس بھرتا چلا جاتا اور میٹھا ہوتا چلا جاتا۔ جاڑوں میں املی کے پیڑ کے نیچے ننھی ننھی گلابی کلیاں اتنی بکھری ہوتیں جیسے گلابی بستر بچھا ہوا ہے۔ یہ کلیاں دانت اور زبان کے بیچ جا کر ہلکی سی کھٹاس کے ساتھ ہمیں ایک نئے ذائقہ سے آشنا کرتیں۔ پھر کھٹی کھٹی کٹاریں جن کا ہر اگودا کتھئی ہوتا چلا جاتا اور اپنے میں ایک مٹھاس پیدا کر لیتا۔

سب ذائقے زائل ہو گئے۔ موسم ہی بدل گیا۔ شب و روز اور سے اور ہو گئے۔ میاں جان کی آنریری مجسٹریٹی جا چکی تھی۔ سو اب کچہری لگنا موقوف تھا۔ نہ مدعا علیہ نہ مدعی، نہ ملزموں کی پکار نہ انصاف طلبی کا شور۔ چراغ حویلی کی ڈیوڑھی ویران نظر آتی تھی۔ میاں جان کا رعب داب ختم تھا۔ اب وہ واقعی بوڑھے پھونس دکھائی پڑتے تھے۔ دنیا جہان کے قصوں بکھیڑوں سے بے تعلق اپنے گوشے میں بیٹھے جانے کیا کچھ بکتے رہتے تھے۔ والد صاحب نے آکر کبھی شہر کا احوال سنایا تو ایک بے تعلقی کے سے انداز

میں سنا۔ اکا دکا بات کی اور پھر اپنے اوراق پر جھک گئے۔ آگے رکھی کالی سیاہی کی دوات میں نرسل کے قلم کو بار بار ڈبونا اور لکھے چلے جانا۔

عزیز واب اللہ ہی اللہ ہے۔ عاصی پر معاصی مشتاق علی گوشہ کنارے بیٹھا ہے اور پیک اجل کا انتظار کھینچتا ہے۔ وقت آخر زمانے نے کیسی آنکھ پھیری ہے کہ ہم اپنے ہی شہر میں اجنبی ٹھہرے ڈیوڑھی سے اس ڈر سے قدم نہیں نکالتا کہ کسی نے کھڑے ہو کر سلام نہ کیا تو فقیر کی کیا عزت رہ جائے گی۔ اپنی عزت سنبھالے گوشے میں بیٹھا ہوں باغ میں بھی جانا موقوف ہے۔ سو نہیں معلوم کہ عزیز اشجار کا کیا حال ہے اور اثمار کی کیا کیفیت ہے۔

اب یہ شہر آفت زدہ شہر ہے۔ دیکھتے دیکھتے کتنے گھر خالی کتنے کوچے ویران ہوگئے۔ بلوے فساد کی خبریں قریب و دور سے دمبدم چلی آ رہی ہیں۔ خبریں کم افواہیں زیادہ افواہ گرم ہے کہ یہاں بھی اب کچھ ہونے والا ہے۔ جو دم گذرتا ہے غنیمت ہے۔ کس دم کیا گذر جائے کچھ خبر نہیں۔ کل ہی کی بات ہے برخوردار مصداق علی خبر لے کر آئے کہ آج رات چراغ حویلی پر حملہ ہوگا۔ پھر برخوردار نے اپنی بندوق بھری اور رات ٹہل ٹہل کر بسر کی۔ ادھر اپنی رات بھی آنکھوں میں کٹ گئی۔

مصداق علی کے دماغ میں عجب سمائی ہے کہ چراغ حویلی کے کوڑے کئے جائیں اور پاکستان کی سمت کوچ کیا جائے۔ میں تحمل سے بیٹے کا خطبہ سنا کیا۔ جب پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تو کہا کہ فرزند جائداد لٹ جائے کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر جائیداد نیلام کی جائے اس میں ہمیں سخن ہے۔ یہ حقیر فقیر اسے آئین غیرت کے خلاف جانتا ہے سو ہمارے جیتے جی تو یہ نہیں ہوگا۔ ہماری آنکھ بند ہو جانے کے بعد تم مالک و مختار ہو۔ باقی پاکستان جانے نہ جانے کے باب میں تمہارا باپ کچھ نہیں کہتا۔ تم بے شک اہل خاندان کو لے کر نئے وطن سدھارو مگر اس افتادہ خاک کو اپنی مٹی میں پڑا سڑنے دو۔

قدم ہمارے اس زمین نے پکڑے ہوئے ہیں۔ جہاں کی مٹی ہے وہیں سار ہو تو اچھا ہے۔ جس دیار میں آنکھ کھولی ہے۔ اسی دیار میں آنکھ بند کریں گے۔

فرزندِ دلبند ہمارا جواب سن کر کبیدہ خاطر ہوئے۔ خاموشی سے اُٹھے اور اپنی بھری بندوق کے ساتھ حویلی کی پہرہ داری کرنے لگے۔ ادھر یہ فقیر اپنے خیالوں میں غلطاں اجداد کو دھیان میں لایا کہ ان کا کیا شعار تھا اور فرزند نے کیا طور اپنایا ہے۔ ہمارے خاندان پر ایسا وقت کب کب نہیں آیا۔ اس خاندان کی تو تقدیر ہی یہ چلی آتی ہے کہ چند پیڑیاں امن چین کے ساتھ گذاریں، اس کے بعد اکھڑے اور دربدر خاک بسر ہوئے پھر کسی دور کے نگر میں جاکر ڈیرے ڈالے اور بہ آئینِ شائستہ اس مٹی سے نباہ کیا۔ مگر کیا مجال کہ آن میں کبھی فرق آنے دیا ہو۔ جب زمیں تنگ ہوئی سب ٹھاٹ چھوڑا اور دامن جھاڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ آئی دولت کو سنگھوانے میں مضائقہ نہیں جانا۔ جاتی دولت کے لئے کف افسوس نہیں ملا۔ ابا جانی فرمایا کرتے تھے کہ جب ہمارا خاندان گلستان محل سے نکلا تھا تو تنکا ساتھ نہیں لیا۔ جیسے بیٹھے تھے بس ویسے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شہر سے نکل کر صبح کے ہون میں دادی حضرت کو پان کی طلب ہوئی۔ متاسف ہوئیں کہ پاندان کیوں ساتھ نہ لے لیا۔ منہ میں کتر نہیں جائے گی تو سفر کیسے کٹے گا۔ دادا جانی نے یہ سن فوراً "جمن میاں کو دوڑایا کہ جاؤ اور پاندان لے کر آؤ۔ جمن میاں نے بھی کمال دکھایا۔ تیر کے موافق گئے۔ خاکیوں سے بچتے بچاتے محل میں پہنچے اور پاندان بغل میں داب کے خرگوش کی مثال زقندیں بھرتے واپس آئے۔ دادی حضرت نے گلستان محل کی خیریت پوچھی۔ جمن میاں ٹھنڈا سانس بھر کے بولے کہ بی صاحب، ڈیوڑھی سونی پڑی تھی۔ کمرے دالان بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ ہاں صحن میں بطخیں شور کر رہی تھیں۔ یہ سن دادی حضرت نے ماتھا پیٹا۔ ہاتھ مل کے بولیں کہ مجھ کال کھاتی کو اتنی سدھ بھی نہ رہی کہ ناند میں پانی بھر آتی۔ دکھیا بطخیں پیاسی ہوں گی۔

خیر یہ فقیر اپنے جیتے جی چراغ حویلی کو گلستان محل نہیں بننے دے گا۔ برخوردار مصداق علی کو میری طرف سے اجازت ہے کہ اپنی سہولت دیکھ کر جس روز چاہیں اہلِ خاندان سمیت پاکستان کی راہ لیں۔ اس درماندہ کو چھوڑ جائیں کہ چراغ حویلی میں رات کو چراغ جلانے کے لئے کوئی تو رہے۔ ویسے چراغ حویلی کی تقدیر میں خانۂ بے چراغ بننا اب لکھا گیا ہے۔ میں آخر کتنے دن جیوں گا۔ بتی سب جل چکی ہے۔ چراغ اب بجھا کہ اب بجھا۔

برخوردار فی الوقت اس حیص بیص میں ہیں کہ بوڑھے باپ کو چھوڑ کر چلے جائیں یا اس کے گذرنے کا انتظار کریں۔ اہلِ خاندان کی غیرت کو گوارا نہیں کہ اس بوڑھے کو وہ پیچھے اکیلی حویلی میں دشمنوں کے بیچ چھوڑ کر چلے جائیں۔ اس باب میں مجبور آنجہانی کے بدھشٹر مہاراج کا عمل اہلِ نظر کے لئے ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بزرگ کتّے کو لے کر اپنے سفر آخر پہ نکلا۔ مگر اس طور کے ساتھ کہ جو پیچھے رہ گیا اور ڈھے گیا اس کی طرف مڑ کر نہ دیکھا۔ بھائی برادر تھکتے گئے ڈھیتے گئے۔ بدھشٹر مہاراج ٹھٹکے بغیر آگے بڑھتے گئے۔ یہاں بھی وقت کا قافلہ تیز قدم ہے۔ ناتواں مشتاق علی تھک کر پیچھے رہ گیا ہے۔ ڈھے گیا ہے۔ مگر اہلِ خاندان بدھشٹر کی بصیرت سے محروم ہیں۔ اگر معاملہ فہمی سے کام لیں تو ان کا سفر بھی کھوٹا نہ ہو اور میں بھی الجھن سے نجات پاؤں۔

سو اس وقت عجب احوال ہے۔ اہلِ خاندان نے مجھے پکڑا ہوا ہے۔ میں نے زمین کو پکڑا ہوا ہے۔ اس مخمصہ سے گلو خلاصی کیوں کر ہو۔ اسی صورت ہو سکتی ہے کہ یہ جان جلدی جان آفرین کے سپرد ہو۔ یہ درماندہ راہ تو چلنے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔ پتہ نہیں فرشتۂ اجل کو آنے میں کیا تامل ہے۔ میں نے اپنے بزرگ مولوی مشتاق علی کا نسخہ بھی استعمال کر کے دیکھ لیا۔ یعنی اب کے ۱۴ شعبان المعظم کی مبارک شب پچھلے پہر بیچ صحن میں کھڑے ہو کر دعائے کمیل پڑھی۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ بِرَحْمَتِکَ الَّتِی وَسِعَتْ کُلَّ شَیٍٔ..... اور پھر بدر کامل کی چاندنی میں اپنی پرچھائیں کا جائزہ لیا کہ

گردن پہ سر نظر آتا ہے یا نظر نہیں آتا۔ اس بے بصر کی نظر نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا۔ دیر تک اپنی پرچھائیں کو تکا کیا پر فیصلہ نہ کر سکا کہ گردن پہ سر نظر آتا ہے یا نظر نہیں آتا۔ اب میں پیدا کرنے والے ہی سے یہ پوچھتا ہوں اور ساتھ میں گڑگڑا کر دعا کرتا ہوں کہ رب العزت میرے فرزند کو شرمندگی سے بچالے اور میری بیکسی کی شرم رکھ لے۔ فرشتہ اجل کو شتابی سے بھیج۔ صاحبو جانا ہمارا ٹھہر گیا ہے۔ آج گئے یا کل گئے۔ مگر اسی آج اور کل میں دن گذرتے جا رہے ہیں اور اس کے ساتھ رنگ فلک دگرگوں اور زمانہ زبوں ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ گنہگار خالق حقیقی سے ایک ہی رحم کا طالب ہے کہ جان جلدی جان آفرین کی نذر ہو۔ یا ارحم الراحمین، رحم، رحم، رحم

تب میں نے سوچا کہ آشیانے کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ بوجان کی موت نے زبیدہ کو عارضی طور پر خاموش کیا تھا۔ مگر اس کے ذہن کی سوئی تو وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ کتنے دن خاموش رہ سکتی تھی۔ میں سادہ دل اس کی وقتی خاموشی سے یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ وہ قصہ رفع دفع ہو گیا اور میرے ذہن سے یہ بات ایسے اتر گئی۔ جیسے کبھی چھڑی ہی نہیں تھی۔

"وہ آج آیا تھا۔ جواب مانگتا تھا۔"

"کون آیا تھا؟"

"پراپرٹی ڈیلر اور کون؟"

"پراپرٹی ڈیلر۔ اچھا۔ اس نے پھر پھیرے لگانے شروع کر دیئے۔" میں ڈر سا گیا۔ دفعتاً مجھے وہ دن یاد آ گئے۔ جب وہ میرے پیچھے پھر رہا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا۔ جیسے میرا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی یا دروازے کی گھنٹی میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگتا۔ بس یہی گمان ہوتا کہ ہو نہ ہو وہی ہے اور بس جیسے اس نے مجھے آلیا ہے۔

"خیر آج کے دن تو میں نے ہی اُسے آنے کے لئے کہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آج تم گھر پہ رہو گے۔ چھٹی کا دن ہے۔ مگر تم صبح ہی گھر سے نکل گئے۔ تم گئے ہو اور وہ آیا ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں کتنا اطمینان محسوس کیا کہ میں صحیح وقت پر گھر سے نکل گیا۔

"پوچھتا تھا کہ کیا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ فیصلہ صاحب کریں گے۔ کسی وقت فون کر کے ان سے وقت لے لینا اور آ کے بات کر لینا۔ کہتا تھا کہ گاہک ابھی ہاتھ میں ہے۔ جلدی فیصلہ کریں۔"

یہ شخص، میں نے سوچا، گلے پہ چھری رکھ کے جواب مانگتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ فی الوقت اسے ٹال دیا جائے۔ ممکن ہے تاخیر سے گاہک بددل ہو جائے اور کوئی اور گھر دیکھے۔ میں نے پراپرٹی ڈیلر کو ٹالنے کی کئی ترکیبیں سوچیں۔ لیکن ہر بار وہی ایک اندیشہ کہ زبیدہ اس ترکیب کو چلنے بھی دے گی۔ گڑبڑ تو، میں نے سوچا، اصل میں گھر کے اندر ہے۔ چھری میرے گلے پہ زبیدہ نے رکھی ہوئی ہے اور چھری جیسے اب گلے کے بالکل قریب آ گئی اور اچانک میرے دل میں ایک شک جاگا کہ کہیں خود زبیدہ نے تو پراپرٹی ڈیلر سے رابطہ پیدا نہیں کیا تھا۔

"کہتا تھا کہ گاہک موٹی اسامی ہے اور ضرورت مند ہے۔ مکان کی اچھی قیمت لگ جائے گی۔"

"پتہ نہیں کون آدمی ہے۔ یہ جو موٹی آسامیاں نظر آتی ہیں۔ بالعموم فراڈ لوگ ہوتے ہیں۔" میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"میں نے پوچھا تھا۔ وہی آدمی ہے جسے لا کر اس نے گھر دکھایا تھا۔"

"وہ آدمی" میں چونکا اور بے ساختہ منہ سے نکلا۔ "وہ سبز قدم۔ مجھے کبھی کبھی

یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ شخص بوجان کی موت کا ذمہ دار ہے۔"

زبیدہ چپ ہی تو ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد بولی بھی تو دوسرے ہی لہجہ میں۔ "پتہ نہیں بوجان کو کیا ہو گیا۔ اچھی بھلی تھیں۔ ایک ساتھ گریں اور ایسی گریں کہ پھر اٹھیں نہیں۔ تین دن میں چٹ پٹ ہو گئیں۔ وہم کی بات تو ہے۔ مگر کیا پتہ ہے کہ اس بخت مارے گھر ہی پہ کوئی اثر ہو۔ مجھے تو یہی شک گذرتا ہے۔ خیر اگر کسی باہر والے کی نحوست تھی تو اب جب ہمیں اس گھر میں رہنا بسنا ہی نہیں ہے تو ہماری بلا سے کہ آنے والے کے نیک قدم ہیں یا سبز قدم ہیں۔"

"زبیدہ میں ایک بات بتا دوں۔" اب میری زبان کھل گئی تھی۔ "اگر میں نے یہ مکان بیچا تو ہمارے خاندان میں مکان بیچنے کی یہ پہلی مثال ہو گی۔ ہمارے والد صاحب نے چراغ حویلی کو فروخت نہیں کیا۔ میاں جان جو منع کر گئے تھے۔ بس تالا ڈال کے نکل کھڑے ہوئے اور یہاں آ کر بھی ہم نے اس کی بنیاد پر کوئی الاٹمنٹ نہیں کرائی۔"

"یہ کوئی عقلمندی کی بات تھوڑا ہی تھی۔ لوگوں نے جھوٹے سچے بھیم داخل کر کے کتنی بڑی بڑی جائدادیں بنا لیں۔ اب وہ رئیس بنے بیٹھے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"خیر پرانی باتوں کو کریدنے میں کیا رکھا ہے۔" زبیدہ نے بات کو لمبا کھینچتا دیکھ کر خود اسے مختصر کر دیا۔ "اب کی بات کرو۔ بخت مارے پراپرٹی ڈیلر کا تقاضے پہ تقاضا آ رہا ہے۔ کہتا ہے کہ جلدی فیصلہ کرو نہیں تو گاہک ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

"فیصلہ میں نے کر لیا ہے۔"

"کیا؟"

"آشیانہ نہیں بکے گا۔" میں نے قطعی لہجہ میں کہا اور فوراً ہی اٹھ کر برآمدے میں آ گیا۔

میں مطمئن تھا کہ بالآخر میں نے اپنے فیصلہ کا اعلان کر دیا ہے اور اب اس کیلئے جواز بھی تو پیدا ہو گئے تھے۔ اب آشیانہ خالی اینٹ پتھر سے بنا گھروندا تو نہیں رہا تھا۔ اس کی ڈیوڑھی سے ایک بزرگ کا جنازہ نکل چکا تھا اور پھر شیریں سے تجدید ملاقات کی یادیں بھی اس کے در و دیوار سے وابستہ ہو گئی تھیں۔ ایک چڑیا ہار سنگھار کے بیچ سے اُڑ کر آئی اور عین میرے سامنے میز پر بیٹھ کر چیں چیں کی اور واپس چلی گئی۔ کیا وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ اس وقت بھی میں اس کی تواضع کے لئے کچھ دانہ دنکا لے کر آیا ہوں۔ یا خالی شکایت کرنے آئی تھی کہ خالی ہاتھ کیوں آئے ہو۔ ادھر ہار سنگھار پر چڑیوں کی برات اُتری ہوئی تھی۔ کتنا شور مچا رہی تھیں۔ اس جواز کی طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا کمرشل ایریا میں نے سوچا، اس علاقہ میں پھیلتا چلا جا رہا ہے تو مجھے کیا۔ میرے گھر میں تو ہار سنگھار بھی مہکتا ہے اور چڑیاں بھی چہکتی ہیں۔ اگر اس علاقہ میں کمرشل ایریا پھیل رہا ہے تو پھر تو گھر کا قائم رہنا اور بھی ضروری ہے۔ چڑیوں کو کہیں تو پناہ ملنی چاہیئے۔ اچانک مجھے لگا کہ چڑیوں کی چہکار میں ایک اضطراب کی کیفیت اور خون کی لہر ہے اور اسی آن میں نے دیکھا کہ ہار سنگھار تلے ایک بلی منڈلا رہی ہے۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ میرے کان کھڑے ہوئے تو آگیا وہ موذی میں بالکل یہ سمجھا کہ پراپرٹی ڈیلر آیا ہے۔ مگر اب میں اس سے خوفزدہ نہیں تھا۔ اب میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے لئے تیار تھا۔ جب زبیدہ کے سامنے میں نے کھل کر بات کر دی تو پراپرٹی ڈیلر کیا چیز ہے۔ میں لپک کر گیٹ پر گیا۔ گیٹ کھولا۔

"ارے کامریڈ، تم ہو۔ تم تو اس روز کے بعد غائب ہی ہو گئے۔ آج صورت دکھائی ہے"

کامریڈ نے میری بات کا جواب دینا مطلق ضروری نہیں سمجھا۔ برآمدے میں آکر تھیلا گلے سے اُتار کر میز پر پٹخا اور کرسی پر پسر گیا۔ میں نے تعجب سے تھیلے کو دیکھا جو کتابچوں رسالوں، اخباروں سے ٹھسا ٹھس بھرا تھا۔ "کامریڈ یہ کیا۔ تم تو تھیلے کو نہر میں خالی کر

آئے تھے۔ یہ تو پھر بھرا نظر آ رہا ہے۔"

"یار کیا کرتا۔ سالی زندگی بے معنی نظر آنے لگی تھی۔ کامریڈ آدمی کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیئے۔ سالے تمہاری طرح میں بے مقصد زندگی نہیں گذار سکتا۔"

"ٹھیک کہا تم نے کامریڈ۔ لدّو جانور کی پیٹھ سے گھاس کا گٹھر اُٹھا لیا جائے تو وہ بیکل ہو جاتا ہے۔ اسے یوں لگتا ہے۔ جیسے وہ بے مقصد زندگی گذار رہا ہے۔"

کامریڈ نے میری بات کو نظر انداز کیا اور پوچھا۔

"پھر گھونسلے کے بارے میں کیا سوچا؟"

اور میں نے یوں جواب دیا جیسے کوئی مشکل مرحلہ کامیابی سے سر کر لیا ہے۔ "کامریڈ میں نے بیگم سے بالآخر صاف صاف کہہ دیا کہ "آشیانہ" ہم نہیں بیچیں گے۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا، بیچو یا رکھو۔" کامریڈ نے سرد مہری سے کہا۔

میں حیران کہ کامریڈ نے آشیانہ کو بیچنے کے خیال کی کس شد و مد سے مخالفت کی تھی اور اب وہ میرے فیصلہ پر کتنی سرد مہری دکھا رہا ہے۔

"میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ کچھ نہیں بچے گا۔ سب جل جاوے گا۔ مروا دیا حرامزادوں نے۔"

"کیا بک رہے ہو کامریڈ۔ ہوش میں تو ہو؟"

"بالکل ہوش میں ہوں۔"

"تمہیں کچھ یاد ہے کہ تم نے "آشیانہ" بیچنے کی کتنی مخالفت کی تھی اور کتنے مجھے طعنے دیئے تھے۔"

"یاد ہے۔ مگر اب سوچتا ہوں کہ شاید بھابی ٹھیک ہی کہتی تھی۔"

"کیا ٹھیک کہتی تھی؟" مجھے کامریڈ پر اب غصہ آنے لگا تھا۔

"یہی کہ آخر اس نے کچھ تو دیکھا ہو گا۔ بھابی جھوٹ بولنے والی خاتون تو نہیں ہے۔"

"اُس نے تو تین مُردے دیکھے تھے۔ کفنیاں پہنے ہوئے تین لمبے بانس جیسے آدمی۔ تم یقین کرو گے اس بیان پر؟"

"یار اس نے تو تین آدمیوں کو کفنیاں پہنے دیکھا تھا۔ مجھے تو اس شہر کا ہر آدمی کفنی پہنے نظر آتا ہے۔"

"کامریڈ، تم واقعی کھسک گئے ہو۔ میں اپنی بیوی کو روتا تھا کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ تم اس سے آگے نکل گئے۔"

"استاد تم نے تو آنکھوں پہ پٹی باندھ رکھی ہے۔ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ کیا ہونے لگا ہے۔"

"کیا ہونے لگا ہے؟"

"گڑبڑ۔ لمبی گڑبڑ نظر آتی ہے۔ پتہ ہے آج کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟"

ایک سوالیہ نشان کی صورت میں گھر سے نکلا اور حیران ہوا یا مظہر العجائب اتنی خلقت۔ اتنا آدم تھا اس شہر میں۔ سب ہی گھروں سے نکل پڑے ہیں۔ مگر کیوں۔ پوچھا کس سے جائے۔ ہر چہرہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ پریشانی سے بھرا سوالیہ نشان۔ جیسے ان پہ کوئی بڑی مصیبت آن پڑی ہو۔ اپنے آپ سے پوچھتا ہوں۔ قصہ کیا ہے۔ کہیں پھر وہی کچھ تو نہیں ہونے لگا ہے۔ شاید۔ پھر تو مجھے واپس گھر جانا چاہیے۔ ہماری عقبی دیوار سے جیل کا دروازہ اور پھانسی کا تختہ دونوں صاف نظر آتے ہیں۔ مجھے یوں بھی گھر پہنچنا چاہیے کہ زبیدہ گھر میں اکیلی ہے۔ اس وقت تو بوجان موجود تھیں اور اس وقت تو زبیدہ نے بھی اسے تماشہ ہی جانا تھا۔ لیکن اب تو ویسے ہی اس کے اندر دہشت سمائی رہتی ہے اور بوجان بھی نہیں ہیں کہ دعا پڑھ کر چار سمتوں میں منہ کر کے چار پھونکیں ماریں اور شیاطین کو دفع کر دیں۔

"بہت زبردست دھماکہ تھا۔"

"دھماکہ۔ اچھا؟ کہاں کب؟"

"پورا شہر ہل گیا۔ کمال ہے آپ کو پتہ نہیں چلا۔ نیو پلازا کا تو ایسا نقشہ ہے جیسے بمباری ہوئی ہو۔"

"نیو پلازا۔ وہ تو بہت پختہ عمارت تھی۔ بالکل بم پروف نظر آتی تھی۔"

"پختہ عمارتوں ہی کو تو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کچے گھروں میں تباہ ہونے کے لئے ہوتا کیا ہے۔ اس عمارت کے تباہ ہونے سے کتنا کچھ تباہ ہو گیا۔ پورے مارکیٹ پہ جھاڑو پھر گئی۔"

خیر نیو پلازا ہمارے گھر سے بہت فاصلے پر تھا مگر بساطیوں والا بازار بھی ہمارے گھر سے دور ہی تھا۔ وہ رات چراغ حویلی میں ہماری آخری رات تھی۔ وہ پوری رات بوجان نے جانماز پر بیٹھ کر اور والد صاحب نے اپنی بھری بندوق کے ساتھ چھت پر بیٹھ کر گذاری۔ بوجان گڑگڑا کر دامن پھیلا کر دعا کرتی رہیں کہ یہ آخری رات خیریت سے گذر جائے کہ صبح کو تو سپیشل میں بیٹھ کر رخصت ہو ہی جانا ہے۔ ہماری گلی میں بالکل سناٹا تھا۔ لیکن دور کے محلوں سے شور و غل کی نعروں کی آوازیں رات بھر آتی رہیں۔ وہ بساطیوں والے بازار کی سمت تھی جس طرف سے شور و غل کی آوازیں زیادہ آ رہی تھیں۔ اسی سمت میں آسمان بھی بہت سُرخ ہو گیا تھا اور والد صاحب نے آسمان کی سرخی سے اندازہ لگایا کہ بساطیوں والے بازار میں آگ لگی ہے اور جب فائر بریگیڈ کی آواز سنائی دی تو گویا ان کے شک کی توثیق ہو گئی۔ شہر میں ہر طرف سے شور و غل کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جا بجا آسمان سرخ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ پورے شہر میں بس ایک چراغ حویلی بچی رہ گئی ہے اور بس ایک گلی خاموش ہے۔

اونگ، ہرینگ، سرینگ، اونگ، بلونگ، بجرنگ، مم کلٹ، بسکٹ مم منور تھی۔